اسلام کے بنیادی عقائد

مصنف

حجۃ الاسلام والمسلمین
السید مجتبیٰ موسوی لاری

جلد چہارم

مترجم

حجۃ الاسلام مولانا شیخ
سید حسن علی نجفی

نام کتاب	اسلام کے بنیادی عقائد
مصنف	حجۃ الاسلام والمسلمین سید مجتبیٰ موسوی لاری
مترجم	حجۃ الاسلام مولانا شیخ روشن علی نجفی
کتابت	ذیشان رضوی بہشتی
ناشر	مرکز نشر معارف اسلامی در جہان
تعداد	۳۰۰۰ (تین ہزار)
تاریخ	ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
چاپ	بار اوّل
مطبع	ہادی پریس قم جمہوری اسلامی ایران

امام کے انتخاب کا طریقہ

علماءِ اسلام میں سے جو مسائل مسلمانوں میں محلِ بحث رہے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ "طریقہ انتخاب امام" کا ہے جس نے مسلمانوں کو دو بڑے فرقوں میں تقسیم کر دیا "سنی" "شیعہ"

شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ امام کو منصوص من اللہ ہونا چاہیے یعنی امام کے معین کرنے کا حق صرف اور صرف خدا کو ہے۔ اسلئے لوگوں کو اس میں مداخلت کرنیکا حق نہیں ہے۔ پیغمبر کی ذمہ داری ہے کہ اپنے وصی کے ذریعہ امام کا تعین کرکے اعلان کرے۔

اس امامت کے بارے میں شیعوں کی تاکید اور انکا یہ عقیدہ کہ ہر زمانہ میں امام اور دینی پیشوا کا تقرر خدا اور اسکے رسول کے ذریعے ہی ہونا چاہیے اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ لوگ مقامِ انسان کی ہدایت اور حقوقِ انسانی کی حفاظت کے قائل ہیں۔

جس طرح نبوت کیلئے کچھ شرائط ہیں بالکل اسی طرح امامت کیلئے بھی شرائط ہیں جنکو رسول کے بعد نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لوگ امام کیلئے عالم، عادل، معصوم ہونیکو شرط جانتے ہیں کیونکہ معارفِ دین کی تفصیل اور کامل معرفت، احکام و قوانین الٰہی کی تبلیغ، معاشرے کے اندر انکا صحیح نفاذ، احکام کی حفاظت اسوقت تک ہو ہی نہیں سکتی تا جب تک امام کے اندر تمام وہ شرائط نہ ہوں جو نبی کیلئے ضروری ہیں

جو خدا خود سرفراز پوشیدہ ہے عالم کے اندر تقویٰ، ثقافت دینی، قوت باطنی کا عالم ہے۔ وہی اس بات کو بھی جانتا ہے کہ امامت الٰہی کس کے سپرد ہونا چاہیئے۔ کون ہے جو ایک سیکنڈ کے لئے بھی دعوت حق اور اصول عدالت سے غفلت نہیں کریگا۔ اور کون ہے جو ہر طرح تمام خدا کے حدود کی حفاظت کر سکتا ہے۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ امام وغیرہ کے بارے میں لوگوں کو مداخلت کا حق نہیں ہے اسکا سبب یہ ہے کہ لوگ کسی کی پاکیزگی، تقوائے باطنی، اسلامی اقدار، قرآن کے بارے میں معلومات کے بارے میں کافی اطلاعات نہیں رکھتے اور نہ ملکوتی طاقت (عصمت) کا ادراک کر سکتے ہیں اس لئے انکو حق نہیں ہے۔

اسی بنا پر ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امام کا تقرر یا تو پیغمبر کیطرف سے ہو یا پھر اسکی معرفی امام وقت کرائے۔ اسی طرح اگر علامات خود اور ابتداء غیب کا اثبات کر سکے اور معجزے وغیرہ کے ذریعہ سے اپنی عصمت و رہبری کی نشاندہی کر سکے تب بھی اس کی امامت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ طریقے ہیں جنکے ذریعہ مذہب شیعہ امام کی شناخت کا قائل ہے اسلئے اگر کوئی ان طریقوں پر عمل کرے اپنے امام زمانہ کو پہچاننا چاہے تو پہچان سکتا ہے۔

●

اسی طرح سنیوں کے یہاں اسکے بالکل ہی برخلاف طریقہ موجود ہے ان لوگوں نے ابتدا ہی سے شوریٰ والی روش اپنائی جو ایک صحیح معیار ملک نہیں ہے اور اسی وجہ سے برادران اہلسنت اور انکے علماء جانشین رسول کے معاملے میں "ٹامک ٹوئیاں مارتے" رہے ہیں۔ خلافت کے سلسلے میں وہ حضرات مندرجہ ذیل چند طریقوں میں سے کسی ایک کو اپناتے ہیں۔

۱۔ اجماع . . . وہ کہتے ہیں خلافت اصول کا مسئلہ ہے امت اسلامی کے آئین کے طور پر کھوٹا ہے۔ اس سلسلے میں صرف لوگوں کا انتخاب ہی حجت ہے۔ اگر امت کسی بھی شخص کو زعامت و امامت کیلئے منتخب کرے تو اس کی بیعت ثابت ہو جاتی ہے اور اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں وہ حضرت وفات رسولؐ کے بعد بیعت اصحاب کو اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ چونکہ اصحاب رسولؐ نے تعیین خلیفہ کیلئے ایک کمیٹی بنائی تھی اور سقیفہ میں موجود لوگوں میں اکثریت نے ابوبکر کو مسلمانوں کا حاکم چنا تھا اس کی بیعت کر لی تھی لہٰذا ابوبکر کی خلافت ثابت ہے۔ پس ابوبکر کے سلسلہ میں اصحاب رسولؐ کا اجماع متحقق ہو گیا اور کسی طرف سے اعتراض بھی نہیں اٹھا لہٰذا اجماع حجت ہے اور اثبات خلافت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اجماع ہے۔

۲۔ شوریٰ . . . خلیفہ کے انتخاب کا دوسرا طریقہ باہم مشورہ اور تبادلہ خیال کے ذریعے کسی کو خلیفہ مقرر کرنا ہے۔ یعنی جب مسلمانوں کی عظیم شخصیتیں مل بیٹھ کر مشورہ کر کے کسی کو زعامت مسلمین کیلئے چن لیں اور رہبری کیلئے معین کر دیں تو پھر امت کا فریضہ ہے کہ اس کی خلافت کو تسلیم کرے اور اس کی اطاعت کرے۔

اس طریقے کے موجد حضرت عمر ہیں۔ انہوں نے صدر اسلام میں اسکو اس طرح ترتیب دیا تھا کہ اپنے مرنے کے بعد کیلئے زندگی ہی میں حکم دیا تھا کہ چھ آدمیوں کو خلافت کا کنڈیڈیٹ معین کر دو اور کہا کہ آپس میں طے کر کے انہی میں سے کسی ایک کو خلیفہ معین منتخب کر لیں اور اپنے آدمیوں کو معین کر دیا تھا کہ تین دن کے اندر یہ لوگ جلسے اور میٹنگ کر کے انہی چھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ اب اگر کسی کیلئے پانچ یا چار افراد رضامندی دیں اور باقی مخالفت کریں تو ان کو قتل کر دو۔ چنانچہ ان لوگوں نے

خلیفہ کے حکم کے مطابق عمل کیا اور بحث و تمحیص و تبادلہ خیال کے بعد عثمان کو خلیفہ چن لیا۔
لہٰذا خلیفہ کے انتخاب کا ایک طریقہ یہ بھی ہوا۔

۲۔ جانشینی . . . یعنی خلیفہ اپنے بعد کیلئے کسی کو جانشین رسولؐ نامزد کر دے۔ یعنی جس فرد کی صلاحیت و استعداد اس پر ثابت ہو جائے اسکو اپنا قائم مقام بنا دے۔ اور صدر اسلام میں یہ طریقہ بھی اپنایا گیا۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو اپنا جانشین معین کر دیا اور مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا۔ اسلئے یہ طریقہ بھی درست ہے۔

جانشین رسولؐ کیلئے اہل سنت کا یہ نظریہ ہے۔

●

یہاں سے ہی حق و باطل کی تمیز کیا جا سکتا ہے اور ان سے اہلسنت نے استدلال کیلئے چنا جس سے پہلا استدلال اجماع ہے۔ تو پہلے امام کا معصوم ہونا اور دین خدا کے تمام کلی و جزئی مسائل پر حاوی ہونا اور بخشش بنگر و رسولؐ کی تحقیق کا مالک ہونا ضروری ہے۔ علاوہ اس پر قرآنی آیات، احادیث رسولؐ اور تاریخی تجربات شاہد ہیں۔ اسلامی تاریخ میں جو ظلم و تعدی، اغلاط و غلطیاں پائی جاتی ہیں اسکی وجہ صرف خلفاء کے خصائص امامت کا فقدان ذکر کیا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ امام کا تعین خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ ایک فرد پر تمام امت مسلمہ کا اجماع ہو جاتا ہے کہ اسی کو جانشین بنایا جائے تو کیا اس سے غلطی نہیں ہوگی؟ اور کیا لوگوں کے اجماع سے اس شخص کی حجیت ثابت ہو جائے گی؟

اور ابو بکر کی بیعت تو چند مٹھی بھر لوگوں نے کی تھی تو اس سے اجماع کہاں ثابت ہوا؟ اگر بالفرض محال اجماع کو حجت مان بھی لیا جائے اور اس واقعہ سے

چشم پوشی ممکن نہیں ہے کیونکہ ابوبکر کیلئے اجماع کا تحقق بہر حال نہیں ہوا۔ کیونکہ یہی بات تو یہی ہے کہ سارے مسلمان اس وقت مدینہ میں رہتے ہی نہیں تو سب بیعت کیسے کر لیتے؟ اور پھر سقیفہ میں مدینہ ہی کے تمام مسلمان نہیں جمع ہو پائے تھے۔ اس کے علاوہ بیعت مکمل بہت سے صحابہ خود سقیفہ میں موجود بعض عظیم صحابی ان تمام حضرات نے ابوبکر کی بیعت ہی نہیں کی تھی۔

بلکہ حضرت علیؑ، مقداد، سلمان، زبیر، عمار یاسر، عبداللہ ابن مسعود، سعد بن عبادہ، عباس ابن عبدالمطلب، اسامہ بن زید، ابی ابن کعب، عثمان بن حنیف، اور دیگر بڑے بڑے صحابہ نے صرف یہ کہ بیعت نہیں کی بلکہ اس انتخاب پر اعتراضات کی بوچھار کر دی اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کھلم کھلا مخالفت کا اظہار کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی اجماع کیسے ہو گیا؟ — یعنی اولاً تو اجماع کی بیعت ثابت نہیں ہے اور ثانیاً بیعت مان بھی لی جائے تو ابوبکر کے لئے اجماع ثابت نہیں ہے۔ لہذا ان کی خلافت بہر حال باطل ہے۔ منزل گم —

ایک جگہ کہ انتخاب جانشین کے سلسلہ میں تمام لوگوں کی شرکت ضروری نہیں ہے بلکہ اگر اہل حل و عقد و علماء جو شوریٰ میں ہیں اور سارے لوگ سے ہی ہوں جب جمع ہو کر لیں تو لوگ الفاظ کہہ کر ماننا ہوگا۔ اور اس کی تقسیم کب ہے جو حق پر متفق ہو کر لیا جائے گا۔

تو یہ امر کہنا درست نہیں کہ یہ عقلی طور پر بھی ایک اور بات ہے کہ کس بنا پر کوئی تقسیم خود مردوں کیلئے واجب العمل ہو جائے اور تمام افراد درجہ میں صاحبان فکر و نظر ہیں، آگاہی، شناخت، تجربہ و پاکی کے اعتبار سے یکساں قابل قبول ہیں اور امت اسلامی کی سرنوشت میں نقش رہائی رکھتے ہیں کیونکہ مشاہدہ ہے کہ بعض لوگ سب سے جدا ہو کر ایک گروہ کی بات کو کیوں تسلیم کر لیں؟

یہ اقدام کیا جائے تو اقلیت کے حق پر ظلم کیا گیا ہے۔ جو لوگ حضرت علیؑ کے ساتھ نہ تھے انکو اکثریت کے ساتھ مل جانے پر مجبور کرنا انکی حق آزادی پر کھلم کھلا ظلم ہے جبکہ خدا و رسولؐ کی طرف سے اس قسم کی بیعت کیلئے کوئی حکم دیا گیا ہو۔ ان لوگوں کو حق تھا کہ اسمیں شرکت نہ کریں۔

اس مقالہ اور تحریرات سے بھی کہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کو بھی بیعت پر مجبور کیا جائے اور انکو اپنا موقف رہنے کیلئے کہا جائے۔ بہرحال جو شخص ہر مومن و مومنہ کا مولا ہو اسکو کسی کی بیعت پر مجبور کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ اور علیؑ افضل پسند شخص نہ اسکو جانشین کا نہ تھا۔ اسی بنا پر ہر شخص کی سمت اور ہر ایک معاشرہ اگر گذشتہ حضرات کی خلافت کے سلسلے میں منفی رویہ اختیار کرے تو اسکو گنہگار نہیں کہا جا سکتا۔ چہ جائیکہ انکو دین سے خارج ہونے کا فتوی دے دیا جائے۔ مترجم

حضرت علیؑ کے دور خلافت میں سعد بن ابی وقاص، عبداللہ ابن عمر جیسے افراد نے حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی مگر حضرتؑ نے انکو اپنی بیعت پر مجبور نہیں کیا بلکہ انکو آزاد رکھا۔

جب خلافت کا تعلق دستور شریعت کے مطابق ہو تو کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو بھی اس کے منتخب کردہ خلیفہ کی پیروی پر مجبور کرے کیونکہ وہ خلیفہ انتخاب سے پہلے کی طرح جیسے غلطی و خطا کرتا تھا انتخاب کے بعد بھی کرے گا کیونکہ اسکا انتخاب کر لینا اسکو معصوم تو نہیں بنا دیگا۔ انتخاب سے اسکے علم و کمال اور صفات دینی میں سے کسی چیز کا اضافہ نہیں ہو جائیگا۔ اور جس شخص کی سطح علمی خلیفہ سے زیادہ ہے جس طرح وہ خلیفہ کی غلطیوں کی پیروی نہیں کر سکتا اسی طرح ہر غیر مجتہد کو بھی یہ حق ہے کہ خلیفہ کی غلطیوں کی پیروی نہ کرے بلکہ خلیفہ کے علاوہ کسی اور کی پیروی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کی

بیعت فرمان رسولؐ کے مطابق ہو تو گویا وہ بمنزلہ بیعت رسولؐ ہے اور اسکی مخالفت جائز
ہے اور اسکے علاوہ کسی اور دوسرے کا پیرو ہونا جائز ہے بلکہ اس زمانے کے اور ائمہ زمانہ
کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسکی اطاعت کریں۔ قرآن نے رسولؐ کی بیعت کو خدا کی
بیعت کہا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ
فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ
اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (پ ۲۶ سورہ فتح آیت ۱۰) بیشک جو لوگ (اے رسولؐ) آپکی بیعت
کرتے ہیں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں انکے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے۔ پس جو بیعت کو
توڑیگا اس نے اپنی ہلاکت پر اقدام کیا ہے اور جو خدا سے کئے ہوئے عہد و پیمان پر باقی
رہیگا خدا اسکو عنقریب اجر عظیم دیگا۔

اور چونکہ جانشین رسولؐ میں تمام صفات پیغمبرؐ کا ہونا لازم ہے سوائے نبوت کے! اور
سب سے زیادہ احکام قرآن اور دین خدا کے دستور کا جاننے والا ہے اس لئے اسکی بیعت
بھی بمنزلہ بیعت رسولؐ ہے۔

قطع نظر ان اشکالات کے اس حدیث کا سہارا لینے کے بعد بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ
اس حدیث پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب کوئی رسولؐ کا اس سلسلہ میں یعنی خلافت
کے بارے میں نص موجود نہ ہو ورنہ اجماع امت اور قول رسولؐ میں تضاد پیدا ہو جائیگا
کیونکہ نص رسولؐ کے ہوتے ہوئے اگر اجماع پر عمل کیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ
اوامر رسولؐ سے اعراض کرنے لگیں گے اور اپنی تشخیص و انتخاب کو رسولؐ کی تشخیص
و انتخاب پر مقدم کرنے لگیں گے۔ لہذا اجماع کو حجت مان بھی لیا جائے تو یہ صرف
ان معاملات میں حجت ہوگا جہاں نص رسولؐ نہ ہو۔

اسکے علاوہ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو میری امت خطا پر اجماع نہیں کریگی۔

کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پُر سکون فضا ہو اور امت کو آپس میں رائے و مشورہ کا حق دیا گیا ہو۔ وہاں پر تبادلۂ خیال کے بعد اگر پوری امت کسی ایک رائے پر متفق ہو جاتی ہے تو اسکو حجت مانا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ امت کے کچھ لوگ ایک مخصوص نظریہ پر لوگوں کو مجبور کرنا چاہیں اور افراتفری کا عالم ہو اس جگہ پر یہ حدیث حجت نہیں ہے۔

سقیفہ میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ انصار اور مہاجروں نے صرف دو شخص کی حکم یا اتفاق بھی دو رائے مشورہ سے عمل نہیں ہوا بلکہ چند مخصوص افراد نے اسکی بنیاد ڈالی تھی اور جبراً لوگوں کو منوانے کی کوشش کی تھی اور فوراً ہی بعد میں ایک شخص کو خلیفہ بنایا۔ اسی لئے حضرت عمر کہا کرتے تھے کہ ابوبکر کی بیعت اتفاقی طور سے تھی جس میں رائے و مشورہ کا کوئی دخل نہیں تھا اب اگر کوئی دوبارہ یہی قدم اٹھانا چاہے تو اسکو قتل کر دو۔ ۱

خلیفہ اول نے بھی جو جملے خلافت میں کہا: میری بیعت ایک اتفاقی طور پر تھی خدا اسکے شر سے لوگوں کو بچائے میں بھی اسکے خطرے سے ڈر گیا۔ ۲

●

پیغمبر اسلام نے اپنی وراثت اور جانشینی کے معاملے میں امت کے مسئلہ میں اور معاملات مسلمین کے بارے میں بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور آپ کی پوری توجہ دین اور نظام مسلمین کی طرف تھی۔ امت کے باہمی اختلاف و تفرقہ سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ مسلمان جس جگہ فاتح ہو کر پہنچتے تھے اور جس زمین پر بھی انکا تصرف ہوتا تھا پیغمبر صاحب پہلے وہاں حاکم کا تقرر کرتے تھے۔ ہر جنگ میں لشکر بھیجتے وقت معین فرما دیتے

---

۱ ابن ہشام ج ۴ ص ۳۰۸ صحیح بخاری ... نے بھی سقیفہ کے سلسلہ میں اسکو ذکر کیا ہے۔

۲ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۳۲

سے جنگ کو بھی تو اپنے بعد میر کا تقرر کر دیتے تھے کہ اگر فلاں سردار مارا جائے تو اس کی جگہ فلاں ہوگا اور اگر وہ بھی مارا جائے تو فلاں شخص علمبردار ہوگا ۔

اور جب بھی حدود مدینہ سے باہر جانے کا قصد کرتے تھے تو اہل مدینہ کے لئے ایک حاکم معین کر جاتے تھے ان حالات میں کیسے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ آنحضرت نے اپنے بعد کے مسلمانوں کے لئے کوئی فکر نہ کی ہوگی ۔ اور تازہ و جوانہ اسلامی معاشرے کو بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ گئے ہونگے ۔ اور اتنا اہم معاملہ جس پر دنیا و آخرت کی سعادت موقوف ہو اسکو یونہی چھوڑ گئے ہونگے ؟

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ خدا ایک رسول کو مخلوق کی ہدایت اور نئے مذہب کی بنیاد گذاری کیلئے بھیجے اور وہ رسول تمام تر پریشانیاں اور رنج و مصیبت برداشت کر کے احکام الٰہی لوگوں تک پہونچائے پھر سب کو یونہی چھوڑ کر چلے جائے اور اپنے بعد کیلئے کوئی انتظام نہ کر جائے یا کون سی منطق اور کون سی عقل اسکو تسلیم کریگی جو دنیا میں کوئی ایسا نمائندہ بھیجے کا جو اتنی زحمتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرنے کے بعد اپنی امت کو حوادث روزگار کے رحم و کرم پر چھوڑ دے ؟

سنت پیغمبر کے علاوہ یہ ایک بات ہے اور عقل کی شان کا اسکے لئے کہیں زیادہ واضح ہے کہ اس مقدس امانت میں بے اعتنائی سے کام لے اور اسکو حوادث کے سپرد کرکے چلا جائے ۔

اگر دین ایک مختصر سا مکتب ہے جسکے احکام و قوانین صرف انکی زندگی کے زمانے میں ہی تو پھر اس دین کے مبینہ خصوصیات کا کام بھی ضروری ہے کہ جو ہمارا کاروان بشریت کی مادی و معنوی ضروریات و جمالی ضرورتوں کو پورا کرسکے اور قافلہ بشری کی رشد و ترقی کو ممکن بنا سکے کیونکہ یہ بات سب ہی کو تسلیم ہے کہ خدا کا آخری رسالت

اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ، حکومت و قیادت کے بغیر ممکن ہے اور اس طرح ایک ایسے امام کا
تقرر ضروری ہے جس میں تمام شرائط و صفات موجود ہوں تاکہ وہ کاروانِ بشریت کو سعادت
دارین کے راستے کی ہدایت کر سکے اور دوسرے نفسانی اور شیطانی سے معاشرے کو
محفوظ بھی رکھ سکے۔ اور اگر ایسا ہو تو دین کا ذریعہ خود لوگوں کے شخصی نظریات و سیاسی
خرافات سے کثیف و مبہم ہو جائیگا جس کی وجہ سے بعض اوقات اس کی اصل روح یا حقیقت ہی ختم ہو
جائیگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اپنے مقصد میں ناکام ہو جائیگا۔

کیا رسولِ اسلام نے جانشینی کے لئے امامت کے حوالے کیا ہوتا تو اس اہم
بات کی تشہیر کرتے اور لوگوں کو بتاتے اور خلیفہ منتخب کرنے کے طریقے بتلاتے اور
تمام مسلمان اس سے مطلع ہو جاتے اور بعد میں کوئی اختلاف بھی نہ رہتا۔

کیا رسولؐ کے بعد امامت کا تعلق خدا اور رسولؐ سے ختم ہو جاتا ہے؟ یا لوگوں کی
صلاحیت انتخاب کے معاملے میں خدا و رسولؐ سے زیادہ ہوتی ہے؟ یا امت اسلامیہ
کی صلاحیت کو خدا و رسولؐ سے بہتر سمجھتی ہے؟

اگر رسولؐ خدا نے خلیفہ معین نہیں کیا تھا تو ابوبکر نے کیوں خلیفہ معین کیا؟ اور رسولؐ
کی پیروی کیوں نہ کی؟ اور اگر رسولؐ خدا نے خلیفہ معین کر دیا تھا تو لوگوں نے اسکو رد
کی عملی طور پر کیوں ترک کر دیا؟!

اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے کہ امام کو ایمان کامل، دیانت، تمام دینی علوم،
اور ان خطا کے قوانین کی معرفت تمام سے متصف ہونا چاہیئے اور جب اختلافی
مسائل در پیش ہونگے اور مشکل معانی قرآن سمجھنے کیلئے مبہم ہونگے تو مسلمان کیا کریں
گے اور کس کی بات کو بعنوان قطعی قبول کریں گے؟ اور یہیں سے رسولؐ اللہ کی جانشینی
کا بھی مسئلہ اٹھتا ہے اور اسکی شدید ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام جانشین رسولؐ میں عصمت کا ہونا ضروری ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب امام عصمت سے بہرہ ور ہیں تو وہ معصوم کی شناخت کیسے کریں تاکہ اس کو خلافت کیلئے منتخب کریں۔ جواب یہ ہے کہ جانشین رسولؐ کا انتخاب مسلمانوں کا ہے تو حضرت عمر نے اس انتخاب کو چھ آدمیوں میں کیوں منحصر کر دیا اور باقی مسلمانوں کو اس حق سے محروم کر دیا؟ جبکہ یہ چھ افراد جو سب کے سب مہاجرین میں سے تھے! "اور انہیں انصار کا ایک بھی نمائندہ نہیں تھا جو ان کا مشیر بھی نہیں تھا" یہ لوگ کس کے سامنے مسلمانوں کی سرنوشت میں مداخلت کا حق رکھتے تھے؟ اور تمام مسلمانوں میں انہیں چھ افراد کو یہ حق کیوں دیا گیا کہ یہ لوگ خلیفہ منتخب کریں اور ان لوگوں کا نظر مسلمانوں پر کیسے واجب العمل ہوگا!

قرآن کی جس آیت میں مشورہ کا حکم ہے یعنی یہ آیت وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (ان کے امور باہمی مشورت سے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب باہمی مشورہ سے انجام دیتے ہیں صرف اتنا ہے کہ مومنین کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امور باہمی مشورے سے انجام دیا کرتے اس آیت میں ہرگز کوئی ایسا کوئی اشارہ اس بات کیلئے نہیں ہے کہ خلافت امامت کا مسئلہ اکثریت کی رائے پر موقوف ہے۔

آیت صرف مومنین کو ترغیب دے رہی ہے کہ آپس میں مشورہ کیا کریں لیکن اگر چند شخص مل کر کسی کو خلافت کیلئے منتخب کرلیں اور اکثریت کی رائے بھی حاصل ہو جائے تب بھی آیت اس بات کو واجب نہیں بتاتی ہے کہ یہ انتخاب تمام مسلمانوں کیلئے واجب ہوگیا۔ اس طرح تمام مسلمانوں کے درمیان عام مشورہ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

اس کے علاوہ اگر شوریٰ ثابت کی ہو تو تمام لوگوں پر واجب ہو کہ مشورہ کرتے

بات طے ہو جائے اسی پر عمل کریں تو وہ شوریٰ ہوگا جس میں تمام مسلمان تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ایک بات پر متفق ہو جائیں نہ کہ چند افراد کسی بات کو طے کر دیں تو وہ تمام مسلمانوں پر واجب ہو جائے خود حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ کو لوگوں کے مشورے سے نہیں منتخب کیا بلکہ اپنی صوابدید پر چھ آدمیوں کو چنا اور کہا کہ یہ خود ان چھ آدمیوں میں سے کسی کو منتخب کریں اور اس کا نام شوریٰ رکھا۔ اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کہ ترجیحی حق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو دے دیا۔ یہ کیسی بات ہے کہ جو حق تمام لوگوں کا تھا وہ چھ آدمیوں کے سپرد کیا گیا نہیں بلکہ ان کے علاوہ شوریٰ کا انتخاب خود حضرت عمر نے کر لیا۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس اسلامی قانون کی بنا پر یہ حکم دیا گیا کہ اگر یہ لوگ خلیفہ کے انتخاب پر متفق نہ ہوں تو سب کو قتل کر دیا جائے بلکہ ایک یا دو مخالف ہوں تو ان دونوں کو یا اس ایک کو قتل کر دیا جائے۔

اور یہ صورت کس سے چھپی ہوئی ہے کہ انہوں نے عمرؓ کو خلیفہ بنانے میں کسی سے بھی مشورہ نہیں کیا اور خلافت کے مسئلہ کو اپنے بعد امت مسلمہ پر نہیں چھوڑا بلکہ خود ہی لکھ کے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ یہ کس قانون اسلام کے مطابق ہو، یہ وہی بتا سکیں گے۔

اصول امامیہ ہے شوریٰ۔ خلیفہ۔ امام کے مقرر ہونے کے بعد ہوتا ہے یا امام کی طرف سے مجلس شوریٰ کی تشکیل کا حکم نافذ ہونے کے بعد ہوتا ہے جس میں ہر دور میں بدلتے رہنے والے مختلف اجتماعی مسائل کے بارے میں تبادلۂ آرا ہو سکتا ہے اور پھر امام ان مسائل اور اجتماعی ضروریات کے پیش نظر اپنا نظریہ پیش کرتا ہے اور مجلس شوریٰ کے ممبران کا فریضہ ہوتا ہے کہ جو لوگ بھی جن چیزوں کے ماہر ہوں ان سے مشورہ کریں۔ اور تمام آرا و نظریات کا استقرار کریں۔ اس کے بعد امام آخری فیصلہ

صادر کرے کیونکہ وہ معاملہ تو شریعت کا ہے کہ جس کا حکم آچکا ہے اور اسی وجہ سے
بھی کہ عوام الناس میں علم و فائدہ مجموعی ہوتا ہے جبکہ علماء شوریٰ کا دور شک سے
بعد عوام کی رائے کی پیروی کا مرتبہ بن جاتی ہے تاکہ وحدت جماعت باقی رہے کیونکہ اگر اختلاف
آراء کی صورت میں تنازعے کے فیصلہ کو قبول نہیں کیا جاتا تو پھر کی حکومت ضعف
و انتشار کا شکار ہو جائے گی جیسا کہ قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے: وَأَطِيعُوا
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (سورۃ انفال آیت)
خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار جاؤ گے
اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ سورۃ شوریٰ میں جو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے
اس سے مراد علماء کی تعیین نہیں ہے۔ یہ ہے کہ سورۃ شوریٰ مکہ میں نازل ہوا اور اس
وقت تک مکہ میں اسلامی حکومت کی تشکیل نہیں ہوئی تھی بلکہ خود مدینہ میں بھی زمان
پیغمبر میں تشکیل حکومت شوریٰ کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی۔

لہٰذا آیت میں جو مسلمانوں کو شوریٰ کی ترغیب دلائی گئی ہے وہ حکومت و نیابت
کے سلسلہ میں نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کے افعال سے متعلق ہے یعنی اسلامی معاشرے
کے ان مختلف مسائل سے متعلق ہے کہ جن سے اسلامی معاشرہ وقتاً فوقتاً دوچار ہوتا
رہتا ہے۔ لہٰذا آیت کے ذریعہ استدلال کرنا کہ خلیفہ کو آپس مشورہ سے منتخب کرنا
چاہیے نہایت ہی بے محل بات ہے کیونکہ حکومت بعد از نزول قرآن کے زمانہ
میں پیغمبر کے ہاتھ میں تھی اور وہ شوریٰ کی بنیاد پر نہیں تھی اور رسول کو مشورہ کی
ضرورت تھی۔

اسکے علاوہ شوریٰ والی آیت کے بعد والے صفحہ میں اتفاق کا ذکر ہے اور یہ

دونوں جملے بعینہ شکل پر دلالت کرتے ہیں کہ وجوب مشورہ وجوب اتفاق پر

ان تمام بحثوں کے علاوہ مشورہ کی دلالت کی آیتوں کے سلسلہ میں آتی ہے جن میں
کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے غزوات سے متعلق ہیں۔ بعض میں صرف مجاہدین کو مخاطب کیا
گیا ہے۔ بعض آیتوں کا روئے خطاب سرکار دو عالم کی طرف ہے اور انہیں کے ضمن
میں مشورہ والی آیت ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس آیت میں مشورہ کا حکم ارشاد نظامت و
حکمرانی ہے کیونکہ رسول اسلام قطعاً اس بات پر مامور نہیں تھے کہ جب مشورہ میں بیٹھے
مشورہ دے دیں تو آپ کو اس کی تقلید ہی کرنی ہے۔ بلکہ قرآن نے تو صریحی طور سے کہہ دیا ہے
فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۔ "جب تم بالآخر ارادہ کرو" (جب آپ کسی بات کا
عزم کر لیں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس ارادے کو پورا کیجئے۔

اس کے علاوہ اس بات میں مشورہ کا تعلق جنگ سے ضرور تھا جیسا کہ ہم نے
اس کے دونوں جملوں سے متعلق ہے فتح یہ تھا رسول اللہ کو اطلاع ملی کہ ابو سفیان
قریش کے تجارتی قافلہ کی قیادت کرتا ہوا شام سے واپس آ رہا ہے تو حضور نے اپنے
اصحاب سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا۔ سب سے پہلے حضرت ابو بکر کی رائے تھی جس کو آپ نے
منظور نہیں کیا پھر حضرت عمر نے اپنی رائے پیش کی آنحضرت نے اس کو بھی رد کر دیا
اس کے بعد مقداد نے اپنا نظریہ پیش کیا جس کو رسول اللہ نے پسند کیا اور قبول فرمایا۔[1]

ظاہر سی بات ہے کہ رسول اللہ کے مشورے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ تمام امور میں
صحابہ کی رائے کی اتباع کر کے عمل کریں۔ بلکہ مشورے کا مقصد مسلمانوں کی تربیت تھی۔
آنحضرت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو مشورہ کا طریقہ اور سوچنے کی رائے معلوم کر کے حقیقت ...

۱۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب غزوۂ بدر [illegible]

اس میں سے صحیح رائے کو لے کر اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتانا مقصود تھا اور یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں میں مشورہ کی سنت کو رائج کیا جائے۔ اور دنیا کے ظالم و جابر جو قوت و طاقت کی وجہ سے عوام الناس سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے ان کے خلاف مسلمانوں کو تربیت دیں اور مسائل جدیدہ میں لوگوں سے مشورہ کر کے ان کا اثبات کریں۔ اور ان کی بھی بہت بڑی بھاری اور اس کے بھی نظریات سے علم حاصل کیا جائے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آخری فیصلہ آپ ہی کا ہوتا تھا جیسا کہ جنگ بدر میں غلطی ہونے سے پہلے ہی اللہ نے رسول اللہ کو تنبیہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور رسول اللہ نے بھی مشورہ کے نتیجے میں تنبیہ سے آگاہ کر دیا۔

لیکن ایک بات کی طرف توجہ دینا ہے۔ آپس میں مشورہ اور تبادلہ خیال کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ بہتر و مفید تر رائے سامنے آ جائے نہ یہ کہ مشورہ سے تکلیف معین کی جاتی ہے کیونکہ جب کسی امر کے متعلق تکلیف ثابت ہو تو پھر اس کے بعد میں مشورہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے اسلامی معاشرے کو یہ حق نہیں ہے کہ جو احکام خدا سے ثابت ہو چکے ہیں انہیں مشورہ کر کے ان کے برعکس اس سے شریعت کے بعض ثابت احکام کا الغاء لازم آئیگا (مثلاً شہر و سرحدوں کی حفاظت میں مشورہ کیا جائے کہ آیا نماز جاری رکھیں یا نہیں ہونی چاہیے) اگر تکلیف شرعی معلوم ہو تو پھر تجدید مشورہ کی کیا ضرورت ہے۔ اور حضرت علی کی ولایت خدا کے حکم سے ابتدائے رسالت ہی میں معین ہو چکی تھی پھر غدیر میں بھی اس کا اعلان کیا گیا اور پھر جب رسول اللہ بستر مرگ پر تھے اس وقت بھی اس کا اعلان ہو گیا۔ تو پھر اب اس مسئلہ میں مشورہ کیسا؟

قرآن کا حکم ہے کہ جہاں پر حکم الٰہی سے کوئی کام معین کیا جا چکا ہو وہاں کسی کو رائے اور خیال کا حق ہے نہ اس کی مخالفت کا حق ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ

الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (پ ۲۲ س احزاب آیت ۳۶) جب خدا اور رسول کسی چیز کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مومن و مومنہ کو اپنے کسی معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جس نے خدا و رسول کی مخالفت کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ دوسری آیت میں ہے: وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (پ ۲۰ س قصص آیت ۶۸) خدا جس چیز کو چاہتا ہے اور اختیار کرتا ہے خدا کے مقابلے میں لوگوں کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

بنا بریں جب انتخاب امیر و امام کا حق صرف خدا کو ہے جب خدا نے بھی امام معین کر دیا تو پھر امیر و امام بنانے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ اور جب لوگوں کے انتخاب میں غلطی کا امکان ہے تو پھر ایسے انتخاب کا کوئی تقدس و حیثیت بھی نہیں ہے اور حیثیت جو بھی افضل کے مقابلہ میں بے فائدہ ہے۔

اور چونکہ امام کا کام لوگوں کی ہدایت کرنا اور سعادت دارین تک ان کی رہنمائی کرنا ہے اسلئے امام کے تقرر کا وہی واحد طریقہ ہے جو قرآن نے نبوت کے لئے بیان کیا ہے کیونکہ امام کی ضرورت بھی انہی دلیلوں پر قائم ہے جن دلیلوں سے نبی اور رسول کی ضرورت پر قائم ہے چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے: إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (پ ۳۰ س لیل آیت ۱۲-۱۳) یعنی ہماری ذمہ داری ہے کہ مخلوق کو ہدایت کریں اور ملک دنیا و آخرت بھی ہمارے ہی لئے ہے۔

لہٰذا ہدایت خلق کی ذمہ داری خدا کی ہے اور وہی انسان کے اسرار و رموز سے واقف ہے اور انسان اپنے مراحل وجود میں بحسب فطرت جن چیزوں کا محتاج ہے ان سے بھی خدا مطلع ہے اور ان ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہدایت بھی ہے جو خدا کیلئے مخصوص ہے لہٰذا خلیفہ و امام وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا یہ منصب عطا کرے۔ (قرآن)

آیات بتلاتی ہیں کہ خدا نے اپنے اس حق کو اپنے رسولؐ کو دیا ہے اور انکی رہبری کو بندگانِ خدا کیلئے واضح کر دیا ہے۔

اب رسولؐ کے جانشین کی امامت معرفت ہی کے لئے ہے کہ امت کا کوئی بھی ہادی و مقتدا ہو جس کی اطاعت تمام لوگوں پر اسی طرح واجب ہو جس طرح رسولؐ کی اطاعت لازم ہے۔ اسلئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کیطرف سے قطعی دلیل کے بغیر بندگانِ خدا کی رہبری کا دعوی کرے۔ اور لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرے۔ اب اگر کوئی شخص دلیل کافی کے بغیر اس منصب کا مدعی ہو تو گویا وہ خدا کے حق کا غاصب ہی ہے۔

●

اور اہل سنت کا یہ نظریہ: حضرت ابوبکر کا عمل اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے خلیفہ کو اپنے بعد کیلئے خلیفہ معین کرنے کا حق ہے ۔۔۔ محل اشکال ہے۔ کیونکہ اگر خلیفہ کا تقرری معصوم کے ذریعہ ہو تب تو ثابت ہے کیونکہ معصوم معصوم کو پہچانتا ہے۔ اور وہ امامت معصوم کے سپرد کر سکتا ہے اور لوگوں کو بتا سکتا ہے۔ لیکن غیر معصوم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کیلئے خلیفہ معین کرے۔ اور سب لوگوں پر واجب ہے کہ اس معین شدہ شخص کی اطاعت کریں۔ اگر کوئی کہے کہ حضرت ابوبکر نے یہ اقدام کیا لیکن مسلمانوں کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تو یہ غلط ہے کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ شدید اعتراضات کئے گئے یہ الگ بات ہے کہ انکا کوئی اثر نہیں ہوا۔

علمائے اہلسنت کے یہ وہ دلائل تھے جنکو وہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کی صحت کیلئے پیش کرتے تھے اور ہم نے انکا جواب دیدیا۔

افضلیت امام کا مسئلہ

من جملہ ان مسائل کے جو شیعہ سُنّی میں پیدا ہوئے سب سے اہم افضلیت امام کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ اہلسنت سواد اعظم کا یہ ماننا ہے کہ ایک شخص موجود ہو جو فضائل اخلاق اور دینی علم و دانش میں کمالات کے اعتبار سے بہتر ہو تو علمائے اہلسنت کی نظر میں اس کے ہوتے ہوئے بھی کسی مفضول شخص کو کرسی خلافت پر بٹھایا جا سکتا ہے اور وہ جانشین پیغمبر ہو سکتا ہے۔

یہ لوگ اپنے نظریے کے ثبوت میں ابوبکر و عمر کی خلافت سے استدلال کرتے ہیں کہ رسولِ خدا کے انتقال کے بعد اسلامی معاشرے میں حضرت علی جیسے شخص موجود تھے جو شائستگی اور کمالات میں، فضائل اور خصوصیات میں تمام مسلمانوں سے بہتر تھے لیکن ان کے ہوتے ہوئے اکثر اصحاب نے ابوبکر کو خلافت کیلئے منتخب کیا۔

لیکن اہل تشیع حضرات کا عقیدہ ہے کہ امامت درحقیقت منجانب خدا الٰہی منصب ہے اور نبوت کے ضمن میں الٰہی کا منصب ہے۔ اسے امامت و خلافت کے عہدہ پر جو شخص سنبھالے دین کی نشر و اشاعت اور مسائل حلال و حرام سے آگاہی اور معاشرے کے اجتماعی معاملات میں رہبری کے لئے کوئی قرآنی نص یا حدیث نبوی ملے سب سے بہتر علم و دین ہو وہ رسول کا جانشین ہو سکتا ہے۔ کمالات و فضائل میں کسی دوسرے سے بہتر اور عصر پیغمبر میں کوئی شخص اس سے بہتر نہ ہو۔ خلفائے وقت ایسے مرد کی بہتر بیت و سرپرست کا تقرر کیا جائے رسول کے بعد احکام الٰہی کے بیان و توضیح پر، مشکلات قرآن کی تفسیر پر قدرت رکھتا ہو احکام میں مرجع ہو، ختم کی حمایت کرنے والا ہو، قرآنی معلومات اور کو جانتا ہو تو پھر ایسی ہی شخصیت کا تقرر

کریگا جو متقدم ہو جسکے معنی کو درجات، باطنی و علمی کمالات سب سے زیادہ ہوں جو جناب
سے رابطہ رکھتا ہو کہ دین الٰہی ہمیشہ اپنے اونچے کمال پر باقی رہے۔ اور متوقع ہو وہ
اسکی تعلیمات کے ذریعہ امت سعادت دارین حاصل کر سکے اور یہ انسان جو تکمیل
ہستی کا پیمانہ باطن سے مشاہدہ کرتا ہے اسلئے عقائد میں انحراف کا امکان ہے اور
عمل میں کسی کوتاہی کا تصور ہے۔

اسلئے جو شخص معاشرہ میں تمام افراد سے بہتر ہو اور علم و عمل میں سب سے ممتاز
ہو وہی امام ہو سکتا ہے۔ ایک روایت میں امام رضا علیہ السلام نے امام کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے
کہ امام گناہوں سے معصوم ہوتا ہے اور عیوب سے پاک ہوتا ہے، علم کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اسکا وجود
مسلمانوں کیلئے عزت اور دین کیلئے سرفرازی ہے، منافقین کیلئے ہلاکت اور کافرین کیلئے
سبب زوال ہے۔ امام اپنے زمانہ کا منفرد ہوتا ہے کوئی شخص اسکی منزلت کو پہنچ نہیں
سکتا اور کوئی دانشمند اسکے برابر نہیں ہو سکتا کسی کو اسکے سامنے [illegible] اسی قسم کے بغیر تمام
فضائل کا جامع ہوتا ہے اور تمام امور شائستہ و [illegible] سے آراستہ ہوتا ہے۔ [illegible] سب سے
بڑا امتیاز ہے جو خدائے [illegible] کی طرف سے اسکو عنایت کیا جاتا ہے۔[1]

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۲۰۰

تمام شد

۲۰ اپریل ۱۹۸۲ء مطابق ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ بروز [illegible] بجے
[illegible] برائے جناب [illegible] حسین صاحب مکان نمبر J ۲۰ [illegible]
راولپنڈی پاکستان